Gohar e tehqeeq گوہر تحقیق
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور

Year 2025; Vol 04 (Issue 02)

P. 41-49 https://journals.gscwu.edu.pk/

ہما سیّد

پی۔ ایچ ڈی سکالر، دی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول نگر کیمپس

ڈاکٹر محمد عبید اللہ

اسسٹنٹ پروفیسر، دی اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول نگر کیمپس

Huma Syed
PhD Scholar, The Islamia University of Bahawalnagar Campus

Dr. Muhammad Obaidullah
Assistant Professor, The Islamia University, Bahawalnagar Campus

علی سردار جعفری کی شاعری؛ نو آبادیاتی و پس نو آبادیاتی تناظر میں

Ali Sardar Jafri's Poetry: A Colonial and Postcolonial Perspective

ABSTRACT

The Progressive Movement emerged during the colonial and postcolonial periods as a conscious literary and intellectual response to political domination, social injustice, and economic exploitation. One of its central objectives was to secure the legitimate rights and dignity of individuals in accordance with contemporary social realities. Under British imperial rule, the people of the subcontinent were subjected to severe exploitation that devastated their economic structures, natural resources, and social fabric. In reaction to this oppression, writers and intellectuals raised powerful voices through literature, giving rise to resistance writing that challenged imperial authority and articulated the suffering of the

masses. Consequently, literature became an enduring force of social awareness and protest.However, the end of colonial rule in 1947 did not bring about the radical transformation that the common people had hoped for. Although political power shifted, systems of exploitation largely remained intact, with local elites and ruling classes replacing foreign rulers. Progressive writers, therefore, redirected their critical gaze toward these indigenous imperialists, exposing their hypocrisy, greed, and continued oppression of the marginalized. Their literary works highlighted class conflict, economic disparity, and the betrayal of revolutionary ideals. In this context, analyzing progressive poetry from a postcolonial perspective becomes essential, as it reveals how literature continued to resist domination, interrogate power structures, and advocate social justice in the post-independence era.

Keywords: Colonialism, Ambivalence, Progressivism, Imperialism, Post-colonialism

نو آبادیاتی نظام سکوت میں ارتعاش کی کیفیت کا نام کہا جا سکتا ہے۔ نو آبادکار ہو یا استعمار کار دنوں ہی تاریخ کے ساتھ ریاکاری اور منافقت کا رویہ رکھتے ہیں۔ محکوموں کو غلام بنا کر ان کے وسائل و معیشت کا بلا دریغ بے رحمانہ استعمال، حرص، طمع، اور احساس برتری سے چور ہو کر نفرت، بربریت اور ظلم کی ایسی انتہاء کہ انسان کے اندر چھپی حیوانیت ظاہر ہو جائے؛ نو آبادیات کو Represent کرتی ہیں۔ انسانی اقدار کی بدترین پامالی نو آبادیاتی نظام کی خالق اقوام کو انسانیت سے دور لے گئیں۔

انسانیت اور انسانی حقوق کسی دور میں بھی بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے نہیں بنے بلکہ انھیں صرف لفاظی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ماضی میں ہر طرح کا اور ہر جگہ اور ہر خطے کا نو آبادیاتی نظام انفرادی اخلاقیات کو رائج کرنے میں ناکام رہا۔ جہاں بھی نو آبادکار اور مغلوب قومیں آمنے سامنے ہوں گی وہاں جبر، سفاکی اور اذیت رسانی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ دکھائی دے گا۔ یہاں انسانی مساوات کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جب غالب اور مغلوب، آقا اور غلام، صاحب اور ماتحت کا رشتہ قائم ہو جائے تو مقامی کا فریضہ صرف پیداوار دینے کا ہے جس میں نو آبادکار نگران کی حیثیت میں ہو گا اور مقامی محض کل پرزہ یا کارندہ۔ برصغیر میں نو آبادیاتی نظام دھیرے دھیرے اپنی جڑیں پھیلاتا رہا اور مقامی راجاؤں مہاراجوں کے آپسی اختلافات کو ڈھال بنا کر اپنا تحفظ کرتا اور پنپتا رہا۔

یہاں اُس وقت تین لوگ آپس میں برسرپیکار تھے۔ نو آبادکار، علاقائی حکومتیں اور تیسری قسم وہ گماشتے تھے جو میر جعفر اور میر صادق ثابت ہو رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے ذاتی مفاد کی جنگ لڑ رہے تھے اسی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامیاب جنگ آزادی نے ہندوستان کے سماج، سیاست، معاشرت اور حال و استقبال پر نہایت درجہ گہرے اثرات مرتب کیے انگریزوں نے اپنی زبردست حکمتِ عملی مقامی گماشتوں، سائنسی ایجادات، جدید جنگی ہتھیار، بالخصوص اطلاعیات کے ٹیلی گرام سسٹم کی

بدولت آزادی کے متوالوں کو ہر محاذ پر ناکامیاب کر لیا تو پھر اگلے مرحلے میں اِن سے خوفناک انتقام کا مرحلہ شروع کیا۔ انتقام کی اِس آندھی کا نشانہ تمام ہندوستانی بلا تخصیصِ مذہب و ملت بنے۔ مظالم کا وہ طوفان لایا گیا جس کی زد سے عورتیں، بچے اور بزرگ شہری تک محفوظ نہ رہے۔ انگریزوں کی اِن سفاکانہ کارروائیوں کے نتیجے میں پورے ہندوستان کا معاشرتی، انتظامی، سیاسی ،مذہبی اور سیاسی وقار تباہ و برباد ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ ابتلا کا زمانہ ادبی تخلیقات کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ شاعر اور ادیب معاشرے کا حساس ترین طبقہ گردانے جاتے ہیں۔ کسی بھی قوم کا حساس طبقہ غربت، افلاس، ظلم و بربریت، قتل و غارت اور شخصی آزادی چھن جانے کے بعد جبر و استبداد اور غلامی کے خلاف مزاحمت کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ شاعر اور ادیب کے پاس اپنی بات لوگوں کے تک پہنچانے کے کئی ہتھیار ہوتے ہیں۔ اگر جبر و استبداد حد سے بڑھا ہوا ہو تو وہ علامت، رمز اور ایمائیت کا سہارا لے کر سچ کی آواز بن جاتا ہے۔ اگر پابندیاں ذرا نرم پڑیں تو وہ بلاواسطہ حکمران کی چیرہ دستیوں اور دسیسہ کاریوں کا پردہ چاک کر کے عام آدمی کے دل میں حریت کا چراغ روشن کرتا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ جبر کے اِس عہد میں اردو کا شاعر اور ادیب مزاحمتی ادب کا الم تھامے میدان میں نکل آتا ہے۔ اردو ادب میں باقاعدہ مزاحمتی شاعری کی شروعات تو انیسویں صدی کے آخر میں جا کر ہوتی ہے لیکن زیرِ لب احتجاج کی صورت مزاحمتی ادب کی ابتدا بہت پہلے سے ہی ہو گئی تھی۔ انیسویں صدی کے مزاحمتی ادب کے حوالے سے عتیق احمد کے رائے بہت اہم ہے :

> "انیسویں صدی کے شعری اور نثری ادب میں تو اجتماعی احساس اور احتجاج کی رو بہت
> کچھ نکھر چکی تھی، لیکن اٹھارویں صدی میں یہ لہجہ کسی مسلسل روایت کی شکل میں
> نہیں ملتا ہے۔" (1)

اٹھارہویں صدی عیسوی میں مزاحمتی شاعری کی ابتدا شہر آشوب سے ہوتی ہے لیکن یہ انیسویں صدی عیسوی میں مزاحمتی شاعری کی زیادہ ڈاریکٹ صورت مزاحمتی نظم اور ازاں بعد غزل کے صورت میں سامنے آئی۔ اِس دور میں نوآبادکار کے حوالے سے اردو شعرا دو رویوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ ان شعرا کا ہے جن کا رویہ نوآبادکار کے خلاف تزاحم سے زیادہ مصالحت کا ہے۔ اس کیٹیگری میں ہم خواجہ الطاف حسین حالی اور سرسید کے رفقاء(ڈپٹی نذیر احمد، آزاد، مولوی ذکا اللہ، چراغ علی اور محسن الملک وغیرہ)کا شمار کر سکتے ہیں جبکہ دوسرا گروہ ان ادباء اور شعرا پر مشتمل تھا جن کا رویہ انگریز کے خلاف سراسر مزاحمتی اور چیلنجنگ قسم کا تھا۔ اس گروہ میں اکبر اللہ آبادی اور اودھ پنچ میں لکھنے والوں کا شمار ہوتا ہے۔

اختلاف، انحراف اور احتجاج ہندوستان کی ادبی روایت میں سرائیت کیے ہوئے ملتا ہے۔ وجہ اِس کی یہ ہے وہ خطہ زمانہ قبل مسیح سے ہی اپنی وسائل، رنگا رنگ موسم اور قدرت کی نعمتوں کی فراوانیوں کی وجہ سے طالع آزماؤں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے۔ ایسی صورت میں مقامیوں میں احتجاج و تزاحم کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے :

> "حساس ادیب جب اپنے کسی معتبر تجربے کو اظہار کی شکل دیتا ہے تو گویا وہ ایک اختلافی یا انحرافی عمل سے گزرتا ہے۔ وہ بلاشبہ کسی سماجی یا انسانی صورت حال کے بارے میں اِس اعتماد سے اپنی بات کہتا ہے کہ اُس میں کچھ نیا ہے۔۔۔ اُس کا تخلیقی تجربہ دوسروں سے اختلاف کا پہلو رکھتا ہے۔ معاصرین کے عام طرزِ فکر سے وہ ایک گریز یا انحراف ہے، دوسری جانب اَس انحرافی رویے میں اکثر احتجاج کا جذبہ اِس لیے شامل ہوتا ہے کہ ادیب اپنے ماحول اور معاشرہ سے ناآسودہ ہوتا ہے۔" (2)

وہ جدید نظم جس کی شروعات انجمنِ پنجاب کے مناظموں سے ہوتی ہے اُسی نظم کو انیسویں صدی کے ربع آخر کے بعض شعرا نے باغیانہ خیالات کے اظہار کے لیے ایک طاقتور میڈیم کو طور پر متعارف کروایا اور موضوعاتی سطح پر اردو شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ نظم کی یہ کروٹہ غزل کی مروج زمین اور مزاج کے خلاف بھی ایک آواز تھی ۔ غزل کے برعکس نظم میں موضوع سے انصاف کرنے اور اُس کی جزئیات تک روشنی ڈالنے کی بھرپور صلاحیت تھی۔ اِسی دور میں نظم کی ایک توانا آواز خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی سنائی دیتی ہے۔ خواجہ حالیؔ نے "مسدس حالی" میں انگریزی استعمار کے خلاف مزاحمتی انداز اپنایا لیکن انکی اِس مزاحمت میں بھی ایک سلیقہ ایک رمزیت اور ایمائیت پنہا تھی۔

مزاحمت کا یہ رویہ آگے بڑھتا ہوا ترقی پسند ادیبوں تک پہنچا اور اِس تحریک کے زیرِ اثر کئی ترقی پسند مزاحمتی شعرا مثلاً علامہ اقبال، فیض احمد فیض اور دیگر شعرا سامنے آتے ہیں جو دراصل اقبال ہی کے افکار کا تھیسس یا اینٹی تھیسس ہی کہے جاسکتے ہیں۔ انھیں شعرا میں ایک نام اختر شیرانی کا ہے اختر شیرانی نے رومان کے پردے میں مزاحمت کو موضوع بنایا اور مقتدرہ کے خلاف باغیانہ خیالات کے ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے ادب کے جتنے بھی دبستان، رجحانات یا تحارک ملتی ہیں اُن میں سے کسی ایک کا بھی منشور تحریر شکل میں موجود نہیں۔ بقول ڈاکٹر انور سدید کے ترقی پسند تحریک ہی وہ واحد تحریک ہے جس منشور باقاعدہ تحریری شکل میں پیش کیا گیا۔۔(۳)

عزیز احمد بھی ایک اہم ترقی پسند ادیب ہیں اُن کے خیال میں ترقی پسند تحریک متوسط طبقے کے استحصال کے آگے بند باندھنے والی توانا آواز اور موثر احتجاج ہے۔ کوثر مظہری نے اپنے ایک مضمون میں ترقی پسند ادب کو مظلوموں کی حمایت اور ظالم کے خلاف

ایک طاقت ور آواز قرار دی اہے۔ وہ ترقی پسند شعرا کو افقِ ادب پر نئے چاند کے پر شکوہ نظارے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسی تحریک جو اجتماعیت کو انفرادیت پر فوقیت کے فلسفے پر قائم، مرکزی کردار سے زیادہ حاشیائی کردار کے طرف دارہے، جو مقتدرہ کی نسبت محکوم کی آواز بننے کے حق میں ہے اور یہی اِس تحریک کی بنیادی فلاسفی ہے ۔(۴)

ترقی پسند ادیبوں کا منشور کسی ایک علاقے تک محدود نہ تھا۔ اِس تحریک سے وابستہ ادیبوں نے دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا بھر کے محکوموں، مزدوروں اور پسے ہوئے طبقات کے حق میں آواز اٹھائی۔ اُن کے ادب کا نکتہ ماسکہ مظلوموں کا پنجۂ سرمایہ دار سے آزاد کرانا اور اُس کی محنت کے پورا پورا صلہ دیا جانا تھا۔

عالمی مزاحمتی ادب کی روایت میں یہ شامل ہے کہ کسی بھی ملک کے شاعر و ادیب مخصوص خطے کی تحریکوں اور مزاحمت کاروں کو ہی موضوع نہیں بناتے۔ اردو ادب میں فیض کے بعد جس نے اس روایت کو قائم رکھا ان کا نام سردار جعفری ہے۔ شاعری میں ایک توانا آواز جو اس استحصال اور جبر کے خلاف پوری قوت سے ابھری وہ علی سردار جعفری کی ہی تھی ۔ احتجاج اور عصری تقاضوں کے مطابق انقلاب ان کی شاعری کا خاصا رہا۔ ان کی نظم "جمہور" میں وہ غلامی سے نجات اور آزادی کی ترغیب دیتے ہیں:

یہ کوچہ چوراں، یہ نگر ظلم کا، یہ شہر
جب تک رہیں گے، جنگ رہے گی ستم گرو (5)

وہ سامراج کے خلاف عوام کو آزادی کی ترغیب دے رہے، حوصلہ، ہمت اور وقت کو بدلنے کی آس اور امید لیے ہیں۔

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو
اٹھو انقلابی جوانو اٹھو
کسانوں اٹھو کامگارو اٹھو
نئ زندگی کے شرارو اٹھو
اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے (6)

زنجیر استعارہ ہے جبری تسلط کا، سامراجیت کا اور برطانوی راج کے تسلط کا اور اسی تسلط سے نجات کے لیے ہند کے جوانوں کو امید کی روشن صبح سے روشناس کروارہے ہیں۔ وہ آخر میں انھیں حوصلے کے ساتھ ساتھ غلامی کے دور اور سامراجیت کے خاتمے کے لیے اور نو آبادیاتی دور کے خاتمے کے لیے غلامی کی زنجیریں توڑنے کا درس دیتے ہیں۔ انھوں نے کمیونزم کے

نظریات کی مکمل تائید کی اور آزادی کے لیے ہر ممکن کوشش کو عمل میں لانے کی ترغیب دیتے رہے۔ سماج کے نچلے طبقے کی حمایت میں انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانے اور ملک کی آزادی کے لیئے اپنی نظموں سے لوگوں کو آگہی دیتے رہے۔

سردار جعفری کی ایک نظم "نئی دنیا کو سلام" میں آزادی کا مطالبہ دیکھیں :

اٹھو کہ ظلمت شب کا حساب ہونا ہے
اجالے آتے نہیں، لائے جاتے ہیں (7)

ہر طبقہ جو اس وقت سامراجیت کی زد میں بے حال تھا اور محکومی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا انھوں نے ان سب کے لیے ملک وطن کا مطالبہ کیا کہ آزادی سب کا حق ہے انہیں آزادی دیں ، اپنا وطن دیں اور سامراج اور برطانوی راج یہاں سے چلا جائے کہ یہ ہندوستان، ہندوستان کے مقامی باشندوں کا ہے۔ جب بغاوت زور پکڑ چکی تھی، ہندوستان کے کونے کونے سے آزادی کے متوالے نکل چکے تھے تب انھوں نے اس وقت کے خونی واقعات کو مد نظر رکھ کر احتجاجی نظم کہی:

بدلا ہے فقط چہرہ حاکم کا مگر لو گو / ظالم کی وہی آنکھیں، وہی انداز حکومت ہے / آزاد ہوئے پر زنجیریں کچھ اور گہری ہو گئیں

اور "وقت کا ترانہ" نظم کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر سڑک پر سخنوروں کا ابال
ہر گلی میں ہے جوشِ طوفانی
غرق کر دے گی بادشاہی کو
آدمی کے لہو کی طغیانی (8)

وہ انقلاب کے نقیب رہے ہیں اور غلامانہ زندگی کے لیے اور سامراج کے خاتمے کے لیے خونی انقلاب کے متمنی ہیں۔ برطانوی استبداد کے خلاف ہمیشہ مورچہ بند رہے وہ مذہب کو نہیں بغاوت کو مذہب کہتے ہیں

مذہب اگر نہ بن پائے انسان کا ہمدم
تو پھر یہ نور ایمان، دلوں میں کیوں اترتا ہے (9)

وہ نظام میں تبدیلی چاہتے ہیں اور محنت کشوں کی حکومت چاہتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے انھیں باغیانہ و دانش ورانہ روش و عمل کا شعر قرار دیا ہے۔ ان کی شاعری میں سیاسی، تاریخی، انقلابی نظریات واضح ہیں ۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی "انہوں نے اپنا مواد عام طور پر قومی جنگ میں شائع ہونے والی خبروں ور اداریوں وغیرہ سے لیا ہے۔"(10)

ڈاکٹر محمد حسن ان کی شاعری پر کچھ ایسے تبصرہ کرتے ہیں:

"سردار جعفری کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ وہ اردو میں فیض اور مخدوم کے بعد
احتجاجی شاعری کی اہم مثال ہیں اور دوسرا یہ کہ اس سے اردو شاعری کے انقلابی رویے پر
اہم سوالات اٹھتے ہیں کیونکہ ؟؟؟ ان کی شاعری تاریخی بھی ہے اور ایک زمانہ کی تاریخ
ساز رہی ہے۔ کیوں کہ اس نے اردو شاعری کے سامنے ایک نئی سمت میں جانے کا رستہ
کھول دیا۔" (11)

علی احمد فاطمی نے علی سردار جعفری کو فارسی ادب کا نباض قرار دیا ہے جس کی تحریر میں رومی حافظ، میر غالب اور اقبال کے دائرہ ہائے فکر سمٹے ہوئے ہیں۔ اُن کے بقول:

"۔۔۔جرأتِ گفتار ایسی کہ بڑے سے بڑے صاحبانِ علم وفضل کے چراغ گل ہو جائیں،
دلیل ایسی کہ پیشہ ور وکیل دستاویز پھاڑ دیں۔۔۔ مجنون گورکھپوری سردار جعفری کی
شاعری کی ابتدا انقلاب سے قرار دیتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ وہ انقلاب سے رومان کی
طرف آئے۔" (12)

علی سردار جعفری نے وقت کی نبضوں کو تھامے رکھا اور دھڑکنوں کے راگ پر وطن کا ترانہ گایا؛ سماج سے جڑے لوگوں کو امید دی، حوصلہ دیا اور نوجوانوں کے ذہنوں کو وقت کے تقاضوں کے مطابق انقلابی بنایا ترقی پسند شاعری میں جو مزاحمتی رویہ پایا جاتا ہے وہ بیک وقت بدیسی نوآبادکار اور دیسی نئے نوآبادکار دونوں کے ساتھ تزاحم کے رویے کا حامل جس میں مستضعفین کی داد رسی، مظلوموں کی حمایت اور جابروں کے خلاف کلمۂ حق کی گونج موجود ہے ۔ سماجی مسائل کے حل لیے ادب کے لیے ذریعے اٹھنے والی یہ آوازیں ادب کو ایک سماجی عمل کا درجہ دیتی نظر آتی ہیں۔اِس لیے شاعری کو سماجی مقاصد کے لیے ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔ سردار جعفری خود کہتے ہیں:

"ترقی پسند مصنفین ادب کو عوام کی ملکیت کہتے ہیں۔اور اس پر زندگی سدھارنے اور
سنوارنے کا فرض عائد کرتے ہیں ؛ جہد وجہد حیات میں اسے بطور حربہ استعمال کرتے
ہیں۔" (13)

سردار جعفری اپنی جذباتیت کے بھی تابع رہے ،اس لیے بیشتر کلام سیاسی نوعیت اختیار کر گیا۔ سردار جعفری کی نظم "سناٹا" دیکھیں:

سناٹا کی چھاوں میں حاکم کا فرمان چلتا ہے
چراغ لب کوئی بجھادے تو یہ شہر سنبھلتا ہے
سڑکیں ہیں خاموش مگر دل میں ہلچلیں باقی
یہ سناٹا ٹوٹے گا مگر جب کوئی حق کی صدا دے گا (14)

سناٹا، چراغ لب، ہلچلیں، اور حق کی صدا ایسے لفظی پیکر ہیں جو ایک طرف تو روایتی نظم سے انحراف کا پتہ دیتے ہیں تو دوسری طرف نو آباکاری عہد کے جبر، بے بسی، سفاکی ظلم، استحصال اور انسانی حقوق کی پائمالی کی کیفیت کو بھی زبان عطا کر رہے ہیں۔ نو آبادیاتی عہد کے خلاف مزاحمتی بیانیے کا قیام اور نو آبادیاتی صورتحال کی ترجمانی اِس سے بہتر شاید اردو نظم میں ممکن نہیں۔ علی سردار جعفری جو ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شامل تھے جن کا منشور ہی کمزوروں کے حقوق کی پاسداری اور محکوم کو اس کا حق دلانا تھا، اپنی تمام تحروروں میں غاصب قوتوں اور آمروں کے خلاف بر سرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ وہ مستضعفین کے لیے ایک طاقت ور آواز بنے تو دوسری طرف مستکبریں کے لیے آزادی کا نعرۂ مستانہ؛ یوں ان کی شاعری اور اس میں چھپے جذبات نے آزادی کی تحریک میں ایک نیا جذبہ بیدار کیا۔

حوالہ جات

1. ارتضیٰ کریم،ڈاکٹر، " اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویے "،(دہلی: اردو اکادمی،2004ء)، ص20
2. رشید امجد،ڈاکٹر، "اُردو میں مزاحمتی ادب کی روایت"، مشمولہ: مزاحمتی ادب،(مرتب) ڈاکٹر رشید امجد،(اسلام آباد: اکادمی ادبیات،1995ء)، ص25
3. انور سدید،ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں"،(دہلی: کاک آفیسٹس پرنٹرز انڈیا)، ص464
4. عزیز احمد، "ترقی پسند ادب"،(دہلی: چمن بک ڈپو، س ن)، ص57
5. علی جواد زیدہ، " اردو میں قومی شاعری کے سو سال"،(اتر پردیش: اتر پردیش اکیڈمی،1982ء)، ص329
6. ایضاً، ص329
7. علی سردار جعفری، " نئی دنیا کو سلام "،(نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،،1972ء)، ص76
8. علی سردار جعفری، "کلیات جعفری"(حصہ اول)، مرتبہ علی احمد فاطمی، "نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، جولائی، ستمبر2004ء)، ص127
9. علی سردار جعفری، "کلیات علی سردار جعفری" حصہ دوم، ص53
10. خلیل الرحمٰن اعظمی، "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک"،(علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس س۔ن)، ص 142
11. محمد حسن،ڈاکٹر، "معاصر ادب کے پیش رو"،(دہلی: مکتبہ جامعہ دہلی 1982ء)، ص78
12. علی سردار جعفری، "کلیاتِ علی سردار جعفری"، مقدمہ: علی احمد فاطمی، ص 13
13. عزیز احمد، "ترقی پسند ادب"، ص45
14. علی سردار جعفری، "لہو پکارتا ہے"،(دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1878ء)، ص184